ابوالکلام آزاد

فرازِ انانیت سے شکستِ ذات تک

ڈاکٹر سید عبدالباری

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ملت اسلامیہ ہند کی آرزؤں کے محور اور ایک روشن مستقبل کے پیامبر تھے۔ وہ اس صدی کی ان عظیم شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے برصغیر کے سیاسی مستقبل کی تشکیل میں حصہ لیا اور گذشتہ دو تین نسلوں کے ذہن و دماغ پر غیر معمولی اثرات مرتب کیے۔ قدرت نے انھیں بے مثل دماغ اور لاثانی قوتِ فکر و عمل سے نوازا تھا مگر یہ ملک و ملت کی بدنصیبی تھی کہ ان کی ذہنی و فکری توانائیوں کو بروئے کار لانے میں ان کی معاون نہ بن سکی اور ان سے پوری طرح فیضیاب نہ ہو سکی اور یہ بھی ایک المناک حقیقت ہے کہ ان کی شخصیت کا ارتقا جن حالات میں ہوا اور جس طرح کے نشیب و فراز سے گذرتے ہوئے وہ سیاسی، معاشرتی اور تمدنی مشاغل کی بیڑیاں اپنے پیروں پر ڈالتے گئے اس نے بہت جلد اس نادر و بوقلموں شخصیت کو شکست و ریخت کا شکار بنا دیا۔ میں اسے اس صدی کی تاریخ ملت کا سب سے افسوس ناک واقعہ سمجھتا ہوں کہ الہلال و البلاغ کے مفکر و قلم کار اور عالم گیر افسردگی و انحطاط کے مراحل میں ملت کی شریانوں میں لہو کی رفتار تیز کرنے اور اجتماعی طور پر اپنی از سر نو شیرازہ بندی کی دعوت دینے والے ابوالکلام کو اس شاہراہ فکر و عمل سے منحرف ہونا پڑا جسے اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں اپنے سفرِ حیات کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس میں گرد و پیش کا ماحول، ان کے دور کی شخصیات یا وہ عوامی حلقے جو براہ راست ان کے مخاطب تھے یا جن کو انھوں نے اپنے پیام اور اپنے مشن کا مخاطب بنایا تھا اتنے ذمہ دار نہ تھے جتنی کہ خود ان کی افتادِ طبع — یہ افتادِ طبع کسی معاملہ میں کسی کے آگے جھکنے اور کسی سے ہار ماننے کو تیار نہ تھی۔ بقول میر ؎

سر کسو سے فرو نہیں آتا   حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

اسی انانیت کے جلوے ان کی پوری زندگی میں کبھی بے حجابانہ اور کبھی ادب والنشا کی باریک چلمنوں کے پیچھے سے ہر ہر قدم پر نظر آتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ مولانا کی یہی کج کلاہی ان کی شکست ذات کا المیہ بن کر سامنے آئی۔

ذرا غور سے دیکھیں تو بظاہر یہ مربوط مستحکم اور ہمالیائی شخصیت متضاد عناصر سے مرکب نظر آتی ہے۔ جس طرح مولانا نے "غبار خاطر" میں ذکر فرمایا ہے کہ انہوں نے سگرٹ کے مسلسل کش اور چائے کے لطیف و خوش گوار جرعات کی ترکیب دے کر ایک نرالے قسم کا کاک ٹیل تیار کیا تھا اسی طرح فطرت نے بھی عجب عجب متضاد رنگ کے پتھروں سے ان کی شخصیت کی دیوہیکل عمارت تعمیر کی تھی۔ ایک طرف قیامت کی داخلیت پسندی وخلوت گزینی دوسری طرف ایسی پرشور و متحرک زندگی جس میں طوفانوں کی سی گھن گرج اور پہاڑی ندی جیسی شوریدگی ایک طرف عوام کے بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب اور نجی محفلوں میں لوگوں سے تابڑ توڑ ملاقاتوں کا سلسلہ دوسری طرف بھیڑ بھاڑ سے بیزاری اور خموشی و تنہائی کی جستجو" ایک طرف گہرے قسم کا مذہبی مزاج اور مشرقی انداز نشست و برخواست اور اسلام کی تعلیمات سے شیفتگی دوسری طرف دنیا کے جدید ترین افکار و خیالات کی قدر شناسی، تازہ ترین رجحانات پر مضبوط گرفت اور اپنے عہد کے مقبول و معروف فلسفوں سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ اس قدر کہ ارونا آصف علی جیسی خواتین مولانا کو بے حد اپ ٹو ڈیٹ، لبرل اور جدید ذہن و دماغ کا انسان تسلیم کرنے میں خوشی محسوس کرتی تھیں۔

مولانا کو اوائل عمر ہی سے طرح طرح کی کشمکشوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ناسازگار احوال کی شوریدہ سر موجیں ان کی ذات کے قطب مینار کو متزلزل کرنے کی کوششیں کرنے لگیں۔ بچپن میں جو ماحول ملا وہ نہایت محدود، نہایت متشددانہ، نہایت تشنج زدہ اور جامد ماحول تھا۔ ان کے والد مولانا خیرالدین کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اپنے مریدوں کے علاوہ بہت کم لوگوں کو صحیح العقیدہ تصور کرتے تھے حتیٰ کہ ہم مسلک ہونے کے باوجود مولانا احمد رضا خاں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ پوری طرح راستی فکر کے حامل نہیں۔ مولانا آزاد کی افتادِ طبع اس جامد ماحول کی کب متحمل ہوتی۔ عنفوان شباب کی طرف بڑھے تو مذہب سے بغاوت کا جذبہ اور ریب و تشکیک سے عشق دامن گیر ہو گیا لیکن اپنے عظیم الشان ماضی اور مضبوط عقیدہ و اقدار سے بے نیاز ہو کر بے قید زندگی گذارنے پر بھلا وہ کیونکر رضامند ہوتے۔ گھریلو ماحول کے جبر سے ردّ عمل کے طور پر

آزادی کی طلب انھیں ریب و تشکیک کے کوچہ میں لے گئی تھی۔ جب یہ علت باقی نہ رہی تو مولانا نے مذہب سے صحت مند بنیادوں پر اپنا رشتہ دوبارہ استوار کر لیا اور اسلام کی انقلاب آفریں تعلیما کو اس زور و شور سے "الہلال" کے دور میں پیش کرنے لگے کہ آج ہم محو حیرت ہو جاتے ہیں مولانا اپنی خود اعتمادی، بلند آہنگی اور انداز استدلال میں امام غزالی سے شاہ ولی اللہ تک تاریخ اسلام کے بہت سے مفکروں اور مصلحوں سے آگے نکل گئے۔ اس عہد میں عالم اسلام کے نمایاں و ممتاز اشخاص اور حوصلہ مند مفکرین و قائدین سے ان کے روابط استوار ہو گئے اندرون ملک شبلی اور بیرون ملک جمال الدین افغانی کی شخصیت ان کے لیے فکر و تخلیق اور جہد و عمل کے میدان میں مشعل راہ بن گئی۔

لیکن جس تیزی سے یہ طوفان اٹھا تھا اسی رفتار سے اس کی لہریں سمٹ کر خاموش ہو گئیں اور کچھ دنوں کے بعد یہ تہہ نشین ہو گئیں۔ حزب اللہ کی تشکیل کی جد و جہد اور ملت اسلامیہ کو زمانہ ساز قوت بن کر ابھرنے کا پیغام دینے کے بعد ان کو توقع تھی کہ اچھے افراد اور بہترین کارکنوں کی ایک جماعت ان کے گرد جمع ہو جائے گی۔ لیکن یہ توقع حسب خواہش پوری نہ ہو سکی اگرچہ مخلصین کی ایک تعداد ان کے لیے فدا کاری کے جذبات کے ساتھ ضرور سامنے آئی مگر کسی طویل و مسلسل جد و جہد کے لیے اسے تربیت دینے والا کوئی نہ تھا۔ بدقسمتی سے مولانا کی لو اجتنی سینہ تاب تھی شخصیت میں اتنی کشش، سوز و گداز اور کشادگی نہ تھی۔ افراد کی تربیت ان کو کسی عظیم مشن کے لیے منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے اور خود افراد کار کی شناخت کرنے کے معاملہ میں وہ ناکام رہے اور نہ ان کو کوئی ایسا مخلص معاون ملا جو ان کے خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی کوشش کرتا۔ سرسید اور شبلی کی طرح وہ اچھے اور مخلص افراد کی جماعت اپنے گرد نہ جمع کر سکے۔ چنانچہ ان کے دور شباب کے سارے ولولے اور منصوبے درہم برہم ہو گئے اور جب ۱۹۲۰ء میں جمعیۃ العلماء کے ایک اجلاس میں ان کو امام الہند بنانے کی تجویز سے علماء نے اختلاف کیا تو مولانا کا اجتماعی شیرازہ بندی کا خواب بکھر گیا اور حزب اللہ کی دعوت بھی موقوف ہو گئی لیکن تحریک خلافت کے اختتام تک وہ اپنے مشن سے کنارہ کش نہ ہوئے اور ملت کو اجتماعیت خود اعتمادی اور توکل علی اللہ کا درس دیتے رہے گو اس زمانہ میں اپنے مخاطبین سے بیزاری کا احساس ان کو نیش زنی کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اپنے اردگرد کے نفاق اور تضاد کے مناظر کو دیکھ کر وہ افسردہ خاطر ہوتے تھے چنانچہ ۱۹۲۰ء کی بنگال خلافت کانفرنس میں وہ

فرماتے ہیں:۔

"متضاد مناظر کا کچھ عجیب عالم ہے جس کو اپنے چاروں طرف پاتا ہوں"۔

مولانا کو شکوہ تھا کہ عوام کے اندر ذوق سفر موجود ہے مگر افسوس ہے کہ ان کے علماء اور راہنما پیر سمیٹے ہوئے بیٹھے ہیں ان کے اندر تذبذب و تنزل اور انتشار موجود ہے۔ فرماتے ہیں:

"دلوں میں دہشت بدستور باقی ہے اور ایمان کی کمزوری نے اب تک روحوں کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ زبانیں جس قدر تیز ہیں قدم میں اس قدر تیزی نہیں ہے اور اعلان میں جس قدر بلند آہنگی اور رعد آسائی ہے عمل میں اس قدر بلند پیمائی نظر نہیں آتی۔ دھواں بڑھتا جا رہا ہے لیکن شعلوں کی چمک کہیں نظر نہیں آتی۔"

مولانا مسلمانوں کو جماعت کی زندگی کی تلقین کرتے رہے اور مسلمانوں کو ایک امام کے تحت ایک رشتے میں پرونے کی فکر میں غلطاں رہے لیکن انھوں نے نصب امام، قیام حزب اللہ اور اجتماعی زندگی گذارنے کو مقصود بالذات بنا دیا۔ حالانکہ یہ وسائل تھے کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے۔ اگر وہ علامہ اقبال یا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی طرح اقامت دین یا اسلامی نظام عدل کے قیام کو مقصود بالذات قرار دیتے تو یہ نصب العین ملت کو متحد و منظم کرنے میں کارگر ثابت ہوتا۔ اگرچہ اس کے لیے بھی افراد کار کی تیاری اور کارکنوں کی تربیت کا ایک طویل مرحلہ طے کرنا ہوتا۔ بدقسمتی سے تربیت اور تزکیہ کا کوئی پروگرام مولانا کے پاس نہ تھا چنانچہ مسلم عوام جو ۱۹۲۰ء میں ان کے اصل مخاطب تھے ان کی باتیں ایک شعلہ بیان خطیب اور ایک علوم اسلامی کے بحر مواج کی حیثیت سے تو ضرور سنتے لیکن ان کے لیے مولانا کے یہاں کوئی عملی دعوت نہ تھی جس پر وہ فی الفور عمل پیرا ہو جاتے۔ مولانا ایک طائر خوش نوا کی طرح ہر وادی و ہر گلستان میں چہچہاتے رہے اور کبھی اس شاخ اور کبھی اس شاخ پر بیٹھ کر صدائے حق بلند کرتے رہے لیکن زمین پر اتر کر معتبر و مستقل مزاج، کارآزمودہ، محنتی و جفاکش اور منصوبہ بند طریقے سے کام کرنے والے افراد نہ چھانٹ سکے اور ان کو ایک رشتے میں نہ پرو سکے۔ پھر جب وہ اپنی صدائے تند و تیز کے باوجود افراد کا کوئی منظم گروہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے نہ پاتے تو افسردہ خاطر ہو کر شکوہ سنج ہوتے:۔

"میری طرف دیکھو میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو سالہا سال سے صرف

ایک ہی صدائے دعوت بلند کرتا رہا۔ صرف ایک ہی بات کی طرف تڑپ تڑپ کر پکار رہا تھا اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہوں۔ تم نے ہمیشہ اعتراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔ باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے مجھے اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و رفیق اپنے سایہ پر قانع رہنا پڑا۔ یہ مدینہ زار عالم جو اپنے ہر گوشہ میں معینوں اور رفاقتوں کے راحت افزا جلوؤں سے معمور ہے میرے لیے ایک صحرائے ریگزار ہے لیکن کبھی ایک آبادی و بستی کا اس نے کام نہیں دیا اور نہ میں کبھی اپنے تئیں اس قابل بنا سکا کہ اس کی رفاقتوں کا ساتھ دے سکوں۔"

(۲۸، ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء بنگال خلافت کانفرنس کلکتہ)

صحرا کے ایک درخت کی مانند یکہ و تنہا ہونے کا یہ احساس مولانا کے اندر رانچی کی نظر بندی کے بعد سے بڑھنے لگا۔ لیکن مولانا اس دردِ تنہائی کا مداوا نہ ڈھونڈ سکے۔ وہ ڈھونڈتے بھی کیوں کر۔ ان کے ذہن و شعور کی دنیا محدود ہوتی جا رہی تھی اور ان کے فکر و تعقل کے قدموں میں بہت سی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مرزا غالب کی طرح وہ بھی اپنی نسلی برتری، خاندانی عظمت، شخصی وجاہت اور سرفرازی عہدِ رفتہ کے شدید احساس میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ یہ خیال مرزا کی طرح عمر بھر مولانا کا بھی پیچھا کرتا رہا کہ وہ ایک عظیم قبیلہ کے چشم و چراغ ہیں اور زمانہ کو چاہیے کہ ان جیسے صاحبِ فضیلت انسان کے سامنے سربسجود ہو جائے۔ خلافت کی سرگرمیوں سے قبل انھوں نے تذکرہ لکھا جو ان کے خاندانی تفاخر اور نسلی برتری کا اعلان نامہ ہے۔ لکھتے ہیں:

"میرے خاندان میں تین مختلف خاندان ہندوستان و حجاز کے ممتاز بیوت علم و فضل و اصحاب ارشاد و ہدایت میں سے ہیں۔ دنیوی عزت و جاہ کی اگرچہ ان میں سے کسی نے خواہش نہیں کی لیکن دنیا نے اپنی عزتوں اور شوکتوں کو ہمیشہ ان کے سامنے پیش کیا اور کبھی انھوں نے قبول کیا اور کبھی رد کیا۔"

اپنی انفرادیت و امتیاز کا وہ اس کتاب میں بار بار اعلان کرتے ہیں:۔

"جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوہ تقلید اور

روشِ عام سے پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا نقشِ قدم راہنما چھوڑ دیا۔"

اُردو شاعری میں تعلّی کا مضمون باندھنے کی روِش عام ہے لیکن مولانا کی ان سطور کے آگے وہ سب زرِ کم عیار محسوس ہوتے ہیں۔ ہر چند کہ ہماری تہذیب انکسار و فروتنی کی تعلیم دیتی ہے اور یہاں اناولاغیری یا اپنی ذات کی رجز خوانی کی اجازت نہیں لیکن بھلا ان رسوم و قیود کے مولانا کیونکر پابند ہوتے اور ان کی یہ انا اتنی سر بہ فلک کیوں نہ ہوتی جب کہ فطرت نے انہیں علم و فضل کے خزانوں سے اس قدر مالا مال کر رکھا تھا کہ کسی دوسرے کو ان کے آگے جرأتِ کلام نہ تھی۔ ابھی وہ عمر کے تیس سال بھی نہیں پورے کر سکے تھے کہ پورے ملک میں الہلال کی وجہ سے ان کا طوطی بول رہا تھا۔ بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی:

"اس نے اُردو صحافت کی جیسے دنیا ہی بدل دی ہو۔ صورت، سیرت، مغز و قالب سب میں اپنے پیش رو اور معاصر ہفتہ واروں سے بالکل مختلف۔ الہلال نکلتے ہی ابوالکلام مسلم طور پر مولانا ہو گئے اور شہرت کے پروں سے اڑنے لگے۔ الہلال کی مانگ گھر گھر ہونے لگی اور مولانا کی خطابت کے جوہر بھی اسی وقت خوب چمکے۔ ہر جلسہ کی رونق ان کی ذات ہونے لگی۔ الہلال بظاہر ایک سیاسی پرچہ تھا لیکن اس کی دعوت تمام تر دینی رنگ میں تھی اور اس کی سیاست پر بین الملی اسلامیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اچھے اچھوں کی قلعی اس کے کالموں میں کھل جاتی اور بڑے بڑے اس سے ٹکر لیتے دبتے اور ہچکچاتے تھے۔ مولانا کی بے پناہ خطابت و فطانت، حاضر جوابی، برجستہ گوئی، بذلہ سنجی کا نمایاں ترین دور یہی رہا ہے۔" (صدق جدید، لکھنؤ، مارچ ۱۹۵۸ء)

عالم یہ تھا کہ ہماری موجودہ صدی کے ربع اوّل کے علماء و مشائخ مولانا کی راستی فکر اور حوصلہ عمل اور ایمانی غیرت کی دل کھول کر داد دے رہے تھے۔ شیخ الہند جیسی عالی مرتبت ہستیوں نے فرمایا تھا کہ ہم جو سبق بھولے ہوئے تھے اُسے ابوالکلام نے ہمیں یاد دلا دیا۔ مولانا سلیمان ندوی نے فرمایا تھا ـــــ "نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام کے الہلال والبلاغ سے پیدا ہوا اور جس اسلوبِ بلاغت اور کمالِ انشاء پردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انھوں نے

انگریزی خواں نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا۔اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیئے"۔ اور پھر یہی نہیں کہ علماء و مشائخ نے مولانا کی تحریروں کو سر آنکھوں پر رکھا بلکہ اس عہد کے اہل قلم اور انشاپرداز بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ بقول رفیع انور:۔

"مشرقیت ان کے اسلوب کا جامہ پہن کر انشائے مغرب کے بہترین نمونوں کو خاک بسر کرتی نظر آتی ہے"۔

اور بقول مولانا دریابادی ـــ " نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان ہر ہفتہ اس ادبی و علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکہ رائج الوقت بن گئے۔ حالی و شبلی کی سلاست و سادگی سر پیٹتی رہی اور اکبرالہ آبادی اور عبدالحق موجودہ بابائے اردو سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے"۔ اور کیوں نہ اس قلم کے جادوگر اور خطابت کے شہنشاہ کے سامنے سب کورنش بجالاتے جب تحریر کا یہ عالم ہو گویا صحرا میں کوئی تنہا درخت چیخ چیخ کر جل رہا ہو اور کوئی پرشور پہاڑی ندی پہاڑوں کے سینے میں شگاف ڈالتی ہوئی رواں دواں ہو۔ چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں ـــ "چند دل کے ٹکڑے ہیں جن کو صفحہ پر بچھانا چاہتا ہوں کیونکر بچھاؤں، چند آنسو ہیں جن کو کاغذ پر پھیلانا چاہتا ہوں کیونکر پھیلاؤں۔ آہ ان لفظوں کو کہاں سے لاؤں جو دلوں میں ناسور پیدا کر دیں۔ آہ اپنے دل کے زخموں کو کیونکر دکھاؤں کہ اوروں کے دل بھی زخمی ہو جائیں"۔

"موت دونوں کو آتی ہے۔ سپاہی کو میدان جنگ میں اور مجرم کو سولی کے تختہ پر۔ پہلی وہ عزت کی موت ہے جس پر ذلت کی ہزاروں زندگیاں قربان اور دوسری وہ ذلت کی موت ہے جس کے بعد انسانی روح کے لیے اور کوئی ذلت نہیں۔ اگر یورپ نے ہم سے آخری انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کاش ہمارے سینہ میں گولی لگتی ہمارے گلے میں پھندا نہ ڈالا جاتا۔"

" صداقت کی مظلومی کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اس پر ابتلا و آزمائش کے ایسے ایسے ہلاکت آفریں وقت آئے جب خدا کی زمین پر چند دلوں کے سوا اس کا کہیں نشیمن نہ تھا لیکن باوجود اس کے سچ سچ رہا اور باطل باطل۔ حق کی قوت کا استحکام متزلزل نہیں ہو سکا"۔

"زندگی عیش ونشاط کا نہیں بلکہ ڈوب ڈوب کر ابھرنے اور قدم قدم پر ٹھوکریں لگنے، چلنے اور گر گر پڑنے لیکن پھر سنبھلنے اور سب کو سنبھال لینے کا نام ہے۔"

طرابلس و بلقان کے خوں چکاں مناظر اور مغربی قوموں کی وحشت و بربریت نے جس طرح اقبال کے جذبات کو متہیج کر دیا تھا اور انھوں نے بیداری مشرق کا پیام خضر راہ کے ذریعہ دیا تھا اسی طرح ابوالکلام نے بھی ڈوبتے ہوئے تاروں کی ماتم گساری کے بجائے ایشیا کی آزادی اور مغربی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑنے کی دعوت دی:۔

"اب آہستہ خرامی کا وقت نہیں۔ساتھ چلنے والوں کی گرد پا کا بھی سراغ نہیں ملتا اور آپ کی نصیحت ہے کہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر چلیں۔"

غرض مولانا اپنی عمر کے تیسویں سال تک پہنچتے پہنچتے شہرت و مقبولیت اور ناموری کے نقطۂ عروج پر تھے اور انھیں پوری قوم اپنا ملجا و ماویٰ سمجھنے لگی تھی۔ظاہر ہے کہ خاندانی عزّ و شرف کے احساس کے ساتھ اس شہرت و مقبولیت نے مولانا کے مزاج کی انانیت کو اور تیکھا کر دیا۔ لیکن اسی نے شعلۂ جوالۂ بن کر ان کی عظمت کے قطب مینار کو جھلس بھی دیا اور آگے چل کر وہ ایک مقبول عام انسان نہ رہ کر ایک مابہ النزاع شخصیت بن گئے۔ غالب اپنی انانیت کی وجہ سے کئی طرح کے ادبی مناقشوں اور مجادلوں کے خارزار میں اس طرح الجھ گئے تھے کہ آخر عمر تک ان کو ذہنی اذیّت سے نجات نہ حاصل ہوئی اور کبھی کبھی نوبت معافی تلافی تک جا پہنچی۔ مولانا آزاد کو بھی اپنی عظمت و عبقریت اور والا گہری کے توانا احساس کی وجہ سے اکثر سخت صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ بالخصوص اپنے اجداد و اسلاف اور نسل و خاندان اور اپنے والد محترم کے مراتب و مناقب کے باب میں انھوں نے جو کچھ لکھا ان میں سے کئی باتیں تحقیق کی خراد پر نہ ٹک سکیں۔ شاید ان کے اوّلین سوانح نگار اور رفیق مخلص مہادیو ڈیسائی نے ان کے بارے میں سچ ہی لکھا تھا:۔

"ایک مقدار میں عزور مباح جو بالعموم خاندانی عظمت و رفعت اور علمی عبقریت کی وجہ سے انسان کے اندر جنم لیتا ہے مولانا کی شریانوں میں رواں دواں تھا۔"

چنانچہ خلافت تحریک میں بھرپور حصہ لینے کے بعد جب ترکی میں خود کمال اتاترک کے ہاتھوں خلافت کے خاتمہ کے نتیجہ میں ہندوستان میں اس تحریک کی روح نکل گئی اور ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ نہرو رپورٹ اور دیگر افسوس ناک واقعات کے سبب درہم برہم ہوگیا تو مولانا خود کو یکا و تنہا محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے اب بھرپور طریقہ سے کانگریس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور مسلمانوں کی لیڈر

شب کی ایک معتد بہ تعداد اس صدی کی تیسری دہائی تک کانگرس سے بدظن ہو کر اس سے علیحدہ ہونے لگی۔ یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ مولانا جنھوں نے الہلال کے دور میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بقول سجاد انصاری اس طرح جگایا تھا جس طرح نفخ صور سے لاکھوں برس کے سوئے ہوئے انسان زندہ ہو جائیں، خلافت تحریک کا چراغ بجھنے کے بعد خود کو رہبر کارواں محسوس کرنے لگے۔ اسی عہد میں مولانا کے ہم عصر علامہ اقبال اہل مشرق کو یہ پیام دے رہے تھے ؎

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

افسوس کہ اس احساس تنہائی نے مولانا کا پیچھا عمر کے آخری مراحل تک نہ چھوڑا اور اس کے اسباب کا انھوں نے کبھی بے رحمی کے ساتھ جائزہ نہ لیا اور خود ترحمی کے حصار سے نہ نکل سکے۔ وہ اپنی اس تنہائی کی اسی طرح کی تاویلیں کرتے رہے جیسی کہ تاریخ کے ہر دور میں تنہا و افسردہ خاطر عبقریوں نے کی ہے۔ اس تنہائی و افسردگی کے زمستانی عناصر کب ان کی شخصیت میں داخل ہوئے اس کا ٹھیک اندازہ لگانے کے لیے ان کی زندگی کی جملہ تفصیلات پر خوردبینی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ ویسے کھل کر اس کی علامتیں یہاں تحریک خلافت کے دور میں نمایاں طور پر محسوس ہونے لگتی ہیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں بنگال کی خلافت کانفرنس میں جو خطبہ مولانا نے ارشاد فرمایا تھا اس میں وہ اپنی ذہنی تنہائی اور وطن میں رہتے ہوئے اپنے غریب الوطن ہونے کا اپنے مخصوص خطیبانہ پیرایہ اور پیغمبرانہ لہجہ میں کھل کر اظہار فرمایا ہے جس کا اقتباس ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ دور خلافت تک شہرت و مقبولیت کے نصف النہار پر پہنچنے کے باوجود مولانا کے سینے میں حزن و الم کے سیکڑوں داغ فروزاں ہو چکے تھے۔ الندوہ کی ادارت سے علیحدگی، شبلی کے ساتھ اہل ندوہ کا برتاؤ الہلال کی دعوت اور حزب اللہ کی کوششوں میں ناکامی، اچھے رفقاء کا فقدان، غرض ملی سیاست نے کئی زخم ان کو پہنچائے تھے اور اب ان کے لیے قومی سیاست کی طرف جانے کے لیے وجہ جواز بھی موجود تھی لیکن متحدہ قوم پرستی کے لیے مولانا کے پاس نئے پرشور و ولولہ انگیز اور مستحکم دلائل نہ تھے۔ اب وہ قرآن کی آیات اور قرون اولیٰ کے امثال و نظائر سے اپنی بات کو مدلل کرنے کے لیے زیادہ فکرمند بھی نہ تھے۔ اس انقلاب آفریں کروٹ کے بعد اب ان پر چوطرفہ یلغار تھی۔ مگر مولانا شکست تسلیم کرنے والے انسان نہ تھے۔ نصب العینی بلند و عالمگیر نہ سہی لیکن مولانا کے لب و لہجہ کی بلند آہنگی اور خود اعتمادی میں فرق نہ آیا تھا۔ انڈین نیشنل

کانگرس کی صدارت اور اس میں سرتاپا انہماک ان کے تصنیفی مشاغل کے لیے سدِّ راہ بن گئے۔ اب صرف مسلمان نہیں بلکہ ہندوستان کے عوام ان کے مخاطب تھے اور اسی تخاطب میں از دل خیزد بر دل ریزد والی بات نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ انھیں نعروں کے ساتھ جو دوسرے لگا رہے تھے بھیڑ میں شامل ہو چکے تھے اور مقصد صرف ملک کی آزادی کا حصول تھا۔ زبان، کلچر اور سیاسی حقوق کی بات اس وقت واضح نہ تھی اور جب واضح ہونے لگی تو مولانا اس سیاسی جماعت میں خود کو بے دست و پا محسوس کرنے لگے جس کی خاطر انھوں نے مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی ناپسندیدگی اور خفگی مول لی تھی اور اس طرح مولانا کے بچے کھچے خوابوں کے بکھرنے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔

اپنی اس سیاسی ہماہمی کے دوران انہوں نے دو اہم علمی و ادبی کارنامے انجام دیے ایک تو قرآن حکیم کی تفسیر "ترجمان القرآن" دوسرے ادبی خطوط کا مجموعہ "غبارِ خاطر"۔ ترجمان القرآن مولانا کی قرآن فہمی اور علمی تبحر کا ایک نادر شاہکار ہے لیکن صد افسوس کہ یہ بھی مولانا سے عام مسلمانوں کو دور کرنے کا سبب بن گیا۔ اس کی جلد اوّل میں مولانا نے یہ نقطۂ نظر پیش کیا:۔

"دنیا کے تمام نزاعات و اختلافات کی ایک سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء و مصطلحات کی کثرت ہے طلبِ صداقت کے اکثر جھگڑے حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشۂ عمل میں حقیقت مسمّیٰ کے اعتبار سے ایک ہی ہے لیکن بھیس مختلف ہو گئے ہیں"۔

مولانا کے قارئین اور قدردانوں کو اب الہلال کے ابوالکلام کے بجائے ایک دوسرا ابوالکلام اپنے سامنے جلوہ گر نظر آیا۔ پہلے کا ابوالکلام اسلام کو آخری اور مکمل صداقت تسلیم کرنے والا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا سودائی تھا اور اب جو پیکر سامنے تھا اس نے نفی سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا اور صرف اثبات کا علم بردار تھا۔ یعنی انسانی قدریں کسی خاص قوم کی امانت نہیں۔ یہ ہر جگہ موجود ہیں اور سب کے حصہ میں آئی ہیں۔ مولانا پہلے عالمگیر ملّی وحدت اور پان اسلامزم کے قائل تھے اور جمال الدین افغانی کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے والے تھے لیکن اب وہ نیشنلزم اور وطن پرستی کا پیغام دے رہے تھے۔ معترضین کی زبانیں بھلا کیوں خاموش رہتیں۔ مولانا کو "الہلال" کے دور کے اپنے اقوال کے سلسلے میں کمزور تاویلوں کا سہارا لینا پڑا۔ چنانچہ لکھتے ہیں ـــــ "کچھ لوگ جنھوں نے الہلال کے پچھلے صفحات پر اس قسم کی بحثیں دیکھی تھیں کہ اسلام کی وسعتِ نظر و طنیت کی تنگ نظری کی متحمل نہیں۔ چونکہ بات کے محل اور موقع

پر ان کی نظر نہیں ہے اس لیے وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نیشنلزم کا مخالف ہے اور کسی مسلمان کو نیشنلسٹ نہیں ہونا چاہیئے۔ حالانکہ نہ تو اسلام کی وسعت نظر کے یہ معنی ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا نہ قومیت کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسلامی ذہنیت کا دائرہ تنگ کیا جائے۔ یہ دونوں افراط و تفریط میں داخل ہیں اور ہر معاملہ کی طرح یہاں بھی حقیقت اطراف میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈھنی چاہیئے"۔

(مضامین ابوالکلام۔ مرتبہ ثناء اللہ خاں۔ لاہور ص ۱۴۲)

الہلال کے دَور میں مولانا کا اندازِ فکر رومانی تھا۔ الہلال کا بنیادی مقصد احیائے، ملت اور فروغ اسلام تھا یا فقط مسلمانوں کو غفلت سے بیدار کر کے انگریزی سامراج کے خلاف ان کو لڑنے کے لیے تیار کرنا تھا۔ اس مسئلہ پر بھی اہل نظر میں کافی اختلافات ہیں۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا خیال ہے کہ " مولانا انگریزی سامراج کے خلاف مسلمانوں کو تیار کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ اس وقت کی فضا میں یہ کام اسلام کی مذہبی اصطلاح اور دینی دعوت کے نام پر ہی ہو سکتا تھا۔"

حنیف ندوی کا خیال ہے کہ وہ ان کے ارتقائے فکر و خیال کی اوّلین منزل تھی جس میں وہ ٹھیٹ مذہبی انسان کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر تھے۔ بعد میں وہ ایک بیکراں شخصیت بن گئے حنیف ندوی کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> " الہلال کے صفحات میں ان کی حیثیت ایک ظاہری کتاب و سنت کے ٹھیٹ حامی کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابن تیمیہ کی روح ان میں عود کر آئی ہے۔ وہی جوش ہے۔ سنت کی حمایت کا وہی انداز ہے۔ وہی وسعتِ نظر ہے۔ وہی فصاحت و بلاغت اور ادبیت ہے۔ وہی جامعیت ہے اور معقولیوں کے جواب میں وہی روشِ استدلال، مگر "ترجمان" میں وہ بالکل ایک نئی شان سے جلوہ آرا ہوئے ہیں۔ یہاں اُس گہرے دینی ذوق کے بجائے نئے افکار و تصورات کی جھلک ہے۔ عقلیت کا غلبہ ہے۔ اس میں مذہب کا تصور زیادہ وسیع اور حکیمانہ زاویہ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ بہت سے ایسے خیالات ہیں جو بھنچے بھنچے معلوم ہوتے ہیں اور مزید توضیح کے محتاج ہیں۔ مولانا نے عمداً ان کو زیادہ نمایاں کر کے نہیں پیش کیا ہے۔"

(ابوالکلام مرتبہ عبداللہ بٹ، قومی کتب خانہ لاہور ص ۴۳)

"ترجمان کے دور میں مذہب و خدا پرستی کی جو بحث مولانا نے کی اور جو اندازِ بیان اختیار کیا

اس سے غلط فہمیوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا اور وہ پیدا ہوئیں۔ مولانا کو اس کا اندیشہ بھی تھا۔ مگر انھوں نے چنداں توجہ اس جانب نہ کی کہ اس کا تدارک کرتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انھوں نے الہلال کے دور کے اپنے انداز فکر میں جو ردّوبدل کیا وہ کوئی فکری انحراف نہیں بلکہ یہ ان کی تاریخی نظر تھی جس نے ان کو کوزہ سے سمندر میں تبدیل کر دیا تھا۔ چنانچہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی رقمطراز ہیں:۔

> "ان میں تاریخی نظر تھی۔ اس نظر سے ان پر یہ حقیقت کھلی کہ اعلیٰ تہذیبی و انسانی قدریں کسی خاص قوم کی امانت نہیں، یہ سب کی ہیں اور ان کی خدمت دنیا کی تمام متمدن اقوام نے تاریخ انسان کے مختلف ادوار میں اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسی طرح اس تاریخی نظر کی بدولت انسان دوستی سے متعلق ان کا جو فکر بنا اُسے ہم مولانا آزاد کے ہیومانزم سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ('' افکار آزاد'' شائع کردہ نہرو انسٹی ٹیوٹ آف ڈیماکریٹک سوشلزم، نئی دہلی ۱۹۶۹ء میں مولانا آزاد پر سیمینار میں ضیاء الحسن فاروقی کے کلیدی خطبہ سے مقتبس)

اس ہیومانزم یا تمام ادیان میں صداقت کی جلوہ گری کے اعتراف یا دوسرے الفاظ میں وحدت ادیان کی حمایت ہندوستان میں بہت سے موحدین اور صوفیوں سنتوں نے بھی کی ہے۔ داراشکوہ بھی اسی وحدت مسالک و مناہج کا علمبردار تھا اور صداقت کو ہر جگہ جلوہ گر دیکھتا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر صداقت اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ ہر دَور میں جلوہ گر تھی تو پھر متواتر پیغمبروں کی بعثت اور ان پر نزول وحی کی ضرورت کیوں پیش آئی اور پھر پیغمبر اسلام و نبی آخر الزماں نے اللہ کی ہدایت اور شریعت حق و منہاج صداقت کی تکمیل کا اعلان کیوں کیا اور گذشتہ تمام شریعتوں کی ناسخ بن کر اور تنہا راہِ نجات کی حیثیت سے شریعت محمدیؐ کیوں رونما ہوئی۔ اس موقع پر داراشکوہ کے ہم عصر ملّا شاہ بدخشی کا جو خود کو بڑا موحد کہتا تھا یہ شعر یاد آتا ہے جو شریعت محمدی کی عظمت و معنویت سے اُس غریب کی ناواقفیت کا غماز ہے ؎

پنجہ در پنجۂ خدا دارم
من چہ پروائے مصطفیٰؐ دارم

صداقت کا چہرہ اگرچہ مسخ نہ ہوتا اور حقیقت کے نقوش اگر مٹ نہ جاتے تو خاتم المرسلین کو پوری دنیا کا ہادی اور اُن کی زندگی کے ہر ہر گوشے کو قیامت تک کے لیے مشعلِ راہ اور واحد وسیلۂ نجات

کیوں قرار دیا جاتا اور خود قرآن بار بار اعلان نہ کرتا کہ حقیقت اولیٰ تک رسائی کا واحد قابلِ اعتماد ذریعہ ذاتِ نبویؐ ہے۔ مولانا نے سورۂ فاتحہ کی جو تفسیر تحریر فرمائی اس پر وحدت ادیان کی پرچھائیں لوگوں نے محسوس کی اور وحدت ادیان کے دعوے دار کے بارے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ خواہ کتنی فلسفہ طرازیاں کرے لیکن خود اپنے عقیدہ اور مذہب کے بارے میں مخلص نہیں ہوتا ورنہ جس چیز کو خود اس نے اختیار کر رکھا ہے اُسے دوسروں سے کامل وافضل ضرور قرار دیتا۔ غرض مولانا کے علمی تبحّر کے باوجود ان کی تفسیر سے علماء و عوام دونوں کو اس قدر وحشت ہوئی کہ دونوں نے اسے رد کر دیا اور یہ صرف لائبریریوں کی زینت بن کر رہ گئی۔

حیرت ہے کہ یہ تفسیر مولانا سے ملّت کے عوام الناس کی دوری کا سبب بن گئی جب کہ قرآن خلق خدا سے انسان کا رشتہ مستحکم بنانے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ عوامی جلسوں میں اب بھی تقریریں کرتے تھے لیکن اب مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ وہ مولانا کا مخاطب نہیں اس لیے کہ وہ اب اس زمین پر اللہ کے قانون کے نفاذ اور اسلام کے نظام عدل کے قیام کے بجائے نیشنلزم کا پیغام لوگوں کو دے رہے تھے۔ اگر ان کی ملّت کے افراد ان کی طرف اب ملتفت نہیں تھے تو مولانا پر اس کا کوئی اثر بھی نہیں تھا۔ ان کے پاس اپنے مزاج کی گوشہ گیری اور خلوت پسندی کا عذر پہلے سے موجود تھا کہ اس کے سبب وہ عوام میں گھل مل نہیں سکتے۔ لوگ اسے مولانا کی عظمت کی دلیل بنا کر بھی پیش کرتے تھے۔ مولانا کے ایک نیاز مند مسٹر مہادیو ڈیسائی ان کے بارے میں بڑے والہانہ انداز میں لکھتے ہیں:۔

> "ان کا گہرا علم اور علم کے لیے بے پناہ شیفتگی اور اس کے ساتھ غور و فکر کرنے کی عادت ان کے لیے یہ ناممکن بنا دیتی ہے کہ وہ عوام میں جا کر ان کے اندر کھو جائیں اور ان کے دکھ سکھ کی نہ ختم ہونے والی کہانی سنیں اور ان سے ہمدردی کا اظہار کریں۔"

لیکن اس مزاج کے باوجود مولانا جب ایک خطیب شعلہ بیان کی حیثیت سے اسٹیج پر آتے تو ان کے سینے میں عوام دوستی کے جذبات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا طوفان نطق و گویائی کا سحر آفریں چشمہ بن کر پھوٹ پڑتا۔ مسٹر مہادیو ڈیسائی لکھتے ہیں:۔

> "میں نے ان کو کھادی پر تقریر کرتے سنا تو جی چاہا کہ وہ گھنٹوں بولتے رہیں انھوں نے کہا۔ سوراج کا کوئی مفہوم نہ ہوگا اگر یہ اس خوفناک کھائی

کو پاٹ نہ دے جو امیروں اور غریبوں کے درمیان موجود ہے اور کھادی کے سوا کسی اور چیز کو زیادہ بہتر طور سے اس معاملہ میں معاون نہیں سمجھ سکتا جو ہمیں اپنے لاکھوں پس ماندہ بھائیوں سے جوڑ دیتی ہے۔ کیا ہم اس بلندی سے جہاں صدیوں سے کھڑے ہیں نیچے اترنا نہیں چاہتے۔ کیا ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے یہ بد قسمت بھائی ہمارے شانہ بہ شانہ کام کریں اور آزادی کی لڑائی میں حصہ لے کر فخر محسوس کریں۔"

لیکن اس گوشہ گیری اور کنارہ کشی کی عادت کے باوجود ان کا سینہ عام انسانوں کی محبت سے لبریز ہے۔ وہ خواہ داعی حق اب نہ ہوں لیکن داعی وقار بنی نوع انسان ضرور ہیں۔ خلافت تحریک سے آزادی ہند تک جب وہ کانگریس کے قائد کی حیثیت سے تحریک آزادی میں حصہ لے رہے تھے وہ ایک آزاد منش صوفی کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جو بڑی حد تک خود کو مذہب و ملت کی قید سے آزاد سمجھتا ہے اور سب کی خیر و سلامتی کی دعا کرتا ہے۔ وہ اس عہد میں صوفیانہ ذوق و حال کے قدر شناس نظر آتے ہیں چنانچہ مولانا عبدالرحمٰن کشمیری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں زندگی بھر کی کد و کاوش کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس راہ میں طمانیت قلب کا مقام بغیر ذوق و حال کے میسر نہیں آتا۔"

(مولانا آزاد اور ان کے ناقد۔ مرتبہ ام اے شاہد موڈرن پبلشرز صدر کراچی ص ۸۵)

وہ اپنی تحریروں میں صوفیانہ مذاق رکھنے والے فارسی شعرا کے اشعار بہ کثرت استعمال کرتے اور اپنے ہم عصر اور اسلامی فکر و نظر کی ایک انقلاب آفریں ترجمان والے عہد ساز شاعر علامہ اقبال کے اشعار سے اس قدر گریزاں ہیں کہ بھولے سے بھی ان کا شعر اپنی کسی تحریر و تقریر میں نہیں آنے دیتے۔ خواجہ عبدالرشید اسی سلسلہ میں خود علامہ کے ردّ عمل کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"۱۹۲۵ء میں جاوید منزل میں علامہ اقبال ایک مجلس میں رونق افروز تھے۔ میں بھی ایک دوست کے ہمراہ وہاں گیا۔ اس موقع پر ایک ادھیڑ شخص نے علامہ سے دریافت کیا۔ 'جناب یہ کیا بات ہے کہ مولانا آزاد بہت سے فارسی و اردو کے اشعار اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں مگر وہ آپ کے شعروں کا حوالہ نہیں دیتے'۔ علامہ اقبال اس سوال پر حیران سے ہوئے مگر انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ 'میں جو باتیں آج کہہ رہا ہوں آزاد یہ سب

باتیں پہلے کہہ چکے ہیں اس لیے میرے اشعار کو دہرانا پسند نہیں کرتے۔" ص۸۳
(مولانا آزاد اور ان کے ناقد۔ ایم اے شاہد)

مولانا کی زندگی کا آخری دَور یعنی آزادی ہند کے بعد کے دس سال سب سے زیادہ المناک تھے جب کہ ایک طرف وہ وطن جس کو متحد و سالم دیکھنے کے وہ آرزومند تھے اپنوں اور غیروں کی ستم ظریفیوں کی وجہ سے تقسیم ہوگیا اور جس متحدہ قومیت اور وحدت بنی نوع انسان کا خواب انھوں نے دیکھا تھا وہ بھی پاش پاش ہوگیا اس لیے کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ مل کر کام کر رہے تھے ان میں سے اکثر اب قوم پرستی کے ایک نئے مفہوم کی طرف افتاں و خیزاں چل رہے تھے اور متحدہ قومیت ایک خاص چولہ بدل کر سامنے آ رہی تھی جو اکثریت کی دیومالا اور مذہبی عقائد کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مولانا کو آزادی سے پہلے ہی اس کا احساس ہوگیا تھا کہ اب ہوا کس رخ پر بہہ رہی ہے چنانچہ انھوں نے لاہور میں ایک نجی محفل میں فرمایا تھا کہ ہندوؤں کا ایک نقطۂ نظر ہے۔ ان کے ذہن میں قوم پرستی کا ایک محدود تصور جنم لے رہا ہے جس میں مسلمانوں کی اپنی تہذیبی خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ گنجائش نہیں۔ لیکن اس عہد میں ان پر ملک کے دیگر رہنماؤں کی طرح جذبۂ حرّیت اس قدر طاری تھا کہ قوم پرستی کے جارحانہ رخ کے بارے میں وہ کوئی اندیشہ محسوس نہیں کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک اب اعلائے کلمۃ الحق کا مفہوم صرف اس قدر تھا کہ انگریز سے آزادی مل جائے۔ حرّیت اس عہد میں ایک مستقل قدر بن کر ابھری تھی حالانکہ مجرّد طور پر یہ لفظ خاصا گمراہ کن تھا۔ حرّیتِ فکر، حرّیتِ وطن، حرّیتِ عمل ــــ آخر آزادی کیسی اور کس طرح اور کن کن میدانوں میں کس حد تک درکار ہے اس کا مفصل جواب ان کے پاس نہ تھا۔ اس وقت مطلق قوم پرستی کے مفاسد اور مغرب کی ذہنی و فکری تحریکوں اور گمراہ کن نظریات کی تردید یا ان کے طلسم سے اہل وطن کو نجات دلانے سے زیادہ انگریزوں کے جسمانی وجود سے نفرت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ آخر اس آزادی کے حصول کا مقصد کیا ہے۔ کیا یہ انسان کو بہتر زندگی کی طرف، ظلم سے نجات اور نظامِ عدل کے قیام کی طرف لے جاسکے گی۔ ظلم بہرحال ظلم ہے خواہ کالے کی طرف سے ہو یا گورے کی طرف سے، غلامی بہرحال غلامی ہے خواہ کالے انسان کی ہو یا گورے انسان کی۔ ہمارے بزرگوں نے حرّیت کو ایک مجرد قدر اور مطلق میزان بنا کر ہمارے لیے مسائل پیدا کر دیئے۔ مغرب اسی وقت اپنے بوجھ تلے دب کر ٹوٹ رہا تھا۔ انگریز دشمنی سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ وہ یہ رہنمائی کرتے کہ آخر وہ کون سا

نظام عدل ہے جس کے ذریعہ آزاد ہندوستان میں مختلف رنگ ونسل اور تہذیب وزبان کے لوگوں کو سکون مل سکے۔ جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے مغربی تصورات کانگرس کے فرمانرواؤں کے ذہن ودماغ میں بسے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ اشتراکی نظام کی بات سوچ رہے تھے۔ مولانا کو اس سیاسی تحریک کے دھارے کے بیچ میں بہہ رہے تھے جو ملک کی زمام ہاتھ میں لینے والی تھی لیکن وہ اس پر اثر انداز ہونے اور اپنے خیالات کے مطابق کسی ایک رخ کی طرف موڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ ان کی ساری فکری وتخلیقی صلاحیتیں نقش برآب ثابت ہورہی تھیں وہ ایک بوڑھے ملّاح کی طرح خاموش عصرِ رواں کی کشتی پر سوار تھے جسے کچھ حوصلہ مند ناخدا اپنی مرضی کے مطابق کھے رہے تھے۔ حالات کے ساتھ مطابقت کا نام اس عہد میں لبرلزم تھا اور مولانا اس قدر لبرل اور وسیع النظر ہوگئے تھے کہ کسی بھی طرزِ فکر پر کوئی تنقید نہیں کرنا چاہتے تھے خواہ وہ اسلام کے نظامِ فکر وعمل سے کتنا ہی متصادم کیوں نہ ہو، اب وہ اس قدر تھک چکے تھے اور اس قدر افسردہ خاطر ہوگئے تھے کہ نہی عن المنکر کا فریضہ زبان کی حد تک بھی ادا کرنے کی ہمت نہ کرسکتے تھے۔ انھیں شکوہ تھا کہ ان کی ملّت ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہے اور انھیں افراد کار نہیں مل رہے ہیں لیکن آخری دور میں جس طرح کے افراد کار ان کے اردگرد تھے بلکہ ان کی نجی زندگی میں دخیل تھے وہ ان کے جیسے عالی دماغ انسان سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتے تھے۔ ان حاشیہ نشینوں نے بھی ان کو حقائق سے دور کردیا ان کے اندر غیرتِ ایمانی کی جو چنگاریاں دبی ہوئی تھیں ان کو ابھرنے نہیں دیا۔ آزادی کے بعد جب ملک کا دستور بن رہا تھا اس وقت بھی اردو زبان کے معاملہ میں، یکساں سول کوڈ کے معاملہ میں، ملازمتوں اور فورسز میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی کے معاملہ میں وہ کسی جرأت کردار کا مظاہرہ نہ کرسکے اور وہ زبان جو جابرۂ وقت کے سامنے کلمۂ حق کہنے اور حق گوئی کا حیرت انگیز مظاہرہ کرنے سے نہ چوکتی تھی خاموش رہی۔ یہ سچ ہے کہ مولانا نے تقسیم ملک کے وقت مسلمانوں کو فرقہ پرستوں کے نرغے سے بچانے اور ان کی بچی کھچی تہذیبی میراث کی حفاظت کی پورے اخلاص کے ساتھ جدوجہد کی لیکن اور بہت سے سنگین مسائل میں وہ خاموش تماشائی بنے رہے اور حالات کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے گئے۔ ہندوستان کی نئی نسلیں آزادی کے بعد ایک ایسے تعلیمی نظام سے روبراہ ہوئیں جو ان کو اپنے ماضی سے کاٹ دینے اور ان کے اندر تفریق وانتشار کے بیج بونے والا تھا۔ نئے حالات میں مسلمان اپنے کو بے یار ومددگار

محسوس کرنے لگے اور اپنے وقار و اعتبار سے محروم ہونے لگے لیکن مولانا نے ان کے حال زار پر توجہ نہ فرمائی اور خود کو قطعاً لاتعلق رکھا۔ بجائے اس کے کہ وہ تاریخ ہندوستان میں ملّتِ اسلامیہ کے لیے ایک نہایت صبر آزما دور میں کوئی لائحہ عمل تجویز کرتے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر آزادیٔ ہند کی تاریخ اور اپنی محرومیوں و ناکامیوں کی داستان رقم کرواتے رہے۔

غرض مولانا آزاد برّصغیر کے وہ واحد عظیم راہنما اور مفکر ہیں جن کی مسافت حیات کو واضح طور پر دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک غلبہ حق کے یقین اور توحید کی قوت پر ایمان کا دور جب وہ حرکت و عمل کے ایک زندہ پیکر اور ملّت کی شریانوں میں حرارت پیدا کرنے والے ایک مجاہد تھے، جب وہ اسلام کو فلاحِ انسانیت کا آخری دستور العمل سمجھتے تھے اور اس دستور کو دنیا میں نافذ کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ دوسرا دور وہ ہے جب انھوں نے اپنی تگ و تاز کو آزادیٔ وطن کے لیے محدود کر دیا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الہلال کی اشاعت رانچی کی نظر بندی اور خلافت تحریک کے بعد ایک طویل سناٹا ہے جو اُن پر محیط ہے گو اِس سناٹے کے دَور میں ترجمان القرآن اور غبار خاطر جیسی تصنیفیں منظر عام پر آئیں لیکن ان میں نوجوان ابوالکلام کے سینے کی حرارت موجود نہ تھی۔ وہ اپنی بے لگام انشاپردازی اور دانشورانہ عظمت سے لوگوں کو مرعوب کرتے رہے لیکن لوگوں کو کوئی بلند نصب العین نہ عطا کرسکے۔ اپنی زندگی کے دوسرے دَور میں جو ۱۹۲۳ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت سے شروع ہوتا ہے وہ صحیح معنوں میں قائد نہیں رہ گئے تھے بلکہ ایک بھیڑ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے تھے جہاں ان کی زیادہ پذیرائی تھی۔ اب ان کے سامنے مسلمانوں کے سیاسی و اجتماعی شعور کی بیداری اور انھیں ایک انقلاب آفریں قوت بنانے کا مشن نہیں تھا بلکہ ایک ایسی آزادی کا حصول تھا جس کے خدوخال خود ان پر واضح نہیں تھے۔ پر جیوں جیوں یہ آزادی اکثریت کی اقلیتوں کے لیے قانون سازی کے حق اور اکثریت کی زبان و کلچر کے اقلیت پر تسلّط کی شکل اختیار کرتی گئی۔ مولانا اندر سے اور زیادہ ٹوٹ گئے اور عملی سیاست سے کنارہ کش سے ہوگئے۔ افسوس کہ انھوں نے تقسیم ملک کی پرہول گھڑیوں میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دے ڈالا کہ انھیں اپنی شیرازہ بندی کرنے یا ملک کے نئے حالات میں اجتماعی طور پر اپنا کوئی لائحہ عمل طے کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جو قومی جماعتیں موجود ہیں ان میں سے کسی کے پیچھے انھیں چل کھڑا ہونا چاہیے۔ اس طرح نئے ہندوستان کے تعمیر میں ان کا کوئی اہم رول مولانا کے نزدیک نہیں تھا اور وہ اقتدار میں برابر

کے شریک بننے کا اب خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

بالآخر جب مولانا کے مشورہ پر عمل کر کے آزادی کے بعد مسلمان ملک کی سیاسی سرگرمیوں سے اپنی تہذیب و اقدار کے ساتھ کنارہ کش ہو گئے تو پھر اخلاقی قوت کے سرچشمے خشک ہونے لگے اور جمہوریت اکثریتی جبر و قہر اور تہذیبی جارحیت سے اقلیت کی حفاظت کرنے اور انھیں انصاف دلانے میں ناکام ثابت ہوئی۔ نفرت و انتقام کا زہر رگ و پے میں پیوست ہوتا گیا۔ اور اب کوئی نہ تھا جو مولانا کے ۱۹۳۹ء کے اس لب و لہجہ میں مسلمانوں سے مخاطب ہوتا:

"مسلمانوں کو صاف طور پر چلّا چلّا کر یہ اعلان کر دینا چاہیے اور اس اعلان کو ہر در و دیوار پر نقش کر دینا چاہیے کہ وہ ہندومت میں جذب ہونے کے لیے ایک لمحہ کے واسطے تیار نہیں۔ بحیثیت مسلمان کے ان کی جو قومی خصوصیات ہیں اس کو نہ صرف باقی رکھیں گے بلکہ ان کو ترقی دیں گے۔"

لیکن سوال یہ تھا کہ آزادی کے بعد کیونکر کوئی اس تیور کے ساتھ زندہ رہنے کا مسلمانوں سے مطالبہ کر سکتا تھا جب کہ متحدہ قومیت کے علم برداروں نے ان کی ملی خصوصیات کے تحفظ کی نئے ہندوستان میں کماحقہ جد و جہد ہی نہیں کی تھی بلکہ اپنی غفلت و لاپروائی سے ان کو ایسے مقام پر لا کھڑا کر دیا تھا جہاں وہ اپنے رہنماؤں سے یہ سوال کر سکتے تھے:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردئی
باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

آزادی سے پہلے مولانا آزاد نے سردار محمد اکبر خاں کو ایک خط میں لکھا تھا کہ مسلمانوں کو اپنے سیاسی مستقبل کا مقدمہ بنانے کے لیے عزم و یقین پر نہ کہ خوف و تشکیک پر کوئی بنیاد رکھنی چاہیے لیکن عزم و یقین کے اس درس کی ضرورت مسلمان شدت کے ساتھ آزادی کے بعد محسوس کر رہے تھے اور اس پیر دانا کو اپنی ملت پر اس قدر غصہ تھا کہ اس نے لب وا نہ کیے۔

غرض مولانا نے اپنی افتادِ طبع اور اپنی فطرت میں پوشیدہ خوئے انانیت کے سبب اپنی خود احتسابی کی کبھی ضرورت محسوس نہ کی اور اپنی اولین احیائے دین، اعلائے کلمۃ اللہ اور مسلمانوں میں نظم جماعت کے قیام کی کوشش میں ناکامی کے بعد جب وہ قومی سیاست میں داخل ہوئے تو اپنی زبردست قربانیوں اور خدمات کے باوجود عبرتناک ناکامی سے دوچار ہوئے جیسا کہ اس دور کے متعدد اہل قلم نے تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کا یہ خیال

صد فی صد درست ہے کہ" مولانا اپنے سیاسی نظریات میں ناکام ہو گئے"
(افکار آزاد - مرتبہ عتیق صدیقی، نئی دہلی ۱۹۶۹ء ص۴۴)

اسی افتادِ طبع کے سبب وہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں متضاد رویوں اور متصادم افکار کو اختیار کرتے اور پیش کرتے رہے اور مولانا کو ان تضادات کا احساس نہ ہو سکا۔ یہ شاید ہر عبقری (GENIUS) کی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ توازن واعتدال کی شاہراہ کا مسافر نہیں ہو سکتا۔ اسے بہر حال کسی نہ کسی انتہا پر رہنا ہے۔ مولانا بھی اسی صف میں شامل تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالدائم جلالی کا یہ خیال درست ہے کہ :-

"میں نے ان کی شخصیت کو مجموعہ اضداد پایا مگر صحت مند مجموعہ اضداد" (افکار آزاد ص۳۱)

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا نے اپنی فکر میں جو حیرت انگیز تبدیلیاں قبول کیں اسی کے مطابق پورے اخلاص کے ساتھ اپنے عمل کو ہم آہنگ بناتے رہے جیسا کہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے بھی تسلیم کیا :-" فکر و عمل کی جیسی خوش گوار وفعّال و خلاق ہم آہنگی ہمیں مولانا کی شخصیت میں ملتی ہے ویسی شاذ و نادر ہی کسی شخص میں ملے گی" (افکار آزاد ص۱) ... چنانچہ جب وہ اعلائے کلمۃ الحق کے داعی تھے اور جب عالم گیر اسلامی اخوت کے پیامبر تھے تو انھوں نے اپنی تحریروں اور اپنی عملی جدوجہد سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک رشتہ میں پرونے اور ملک و سماج کے لیے ان کو زیادہ سے زیادہ خیر و برکت کا وسیلہ بنانے کی زبردست جدوجہد کی اور پھر جب قومی تحریک کے قائد ہوئے تو اس ولولہ کے ساتھ کہ کانگرس کی لیڈر شپ میں سب سے آگے اپنا مقام بنا لیا اور سب سے زیادہ حرکت و عمل کا مظاہرہ کیا اور پھر جب آزادی حسب خواہش نہ ملی اور احباب کے ساتھ انھوں نے شانہ بشانہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تو وہ گوشہ گیر ہوئے اور اس طرح کہ پھر کبھی زبان نہ کھولی اور نہ کسی بڑے عوامی جلسے میں شرکت کی۔

سجاد انصاری اقبال اور ابوالکلام کو فوق البشر قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے لیے یہ بات درست ہو یا نہ ہو مولانا ابوالکلام کے لیے یقیناً درست ہے اس لیے کہ اگر وہ صرف بشر ہوتے تو ان کی پوری زندگی میں زیادہ توازن تناسب توافق و ہم آہنگی ہوتی جس کے فقدان کے سبب ان کے ارشادات کی بکھری کڑیوں کو مربوط بنانا بڑا مشکل امر ہے۔ کاش وہ صنوبر کی طرح فکر و عمل کے گلشن میں آزاد بھی ہوتے اور پابہ گل بھی اور ان ہی پابندیوں میں آزاد بننے کی کوشش کرتے اور کاش اعلائے کلمۃ الحق کے جس مشن کا انھوں نے آغاز کیا تھا اس کو آزادی ہند تک پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے ہوتے تو یہ آزادی کس قدر ستھری، کس قدر دلکش اور کس قدر تابناک ہوتی۔

مکتبہ تحقیق

سیرت صحابہ

۱۔ آسمان ہدایت کے ستر ستارے — طالب ہاشمی — -/۷۰
۲۔ اسوۂ صحابہ — عبدالسلام ندوی اول — -/۲۴
۳۔ " " دوم — -/۴۵
۴۔ سیرت عائشہؓ — سید سلیمان ندویؒ — -/۲۵
۵۔ حضرت ابوبکر صدیق — سید عبدالصبور طارق — -/۳۰
۶۔ فقہ عمر — شاہ ولی اللہ دہلوی — -/۵۰
۷۔ حضرت عائشہؓ — عباس محمود عقاد — -/۲۵
۸۔ حضرت علی — علی اصغر چودھری — -/۲۰
۹۔ حیات حضرت ابوبکر — شیخ علی الطنطاوی — -/۴۰
۱۰۔ تذکار صحابیات — طالب ہاشمی — -/۷۰

دعوت وتحریک

۱۔ تحریک اسلامی ہند — مولانا صدرالدین اصلاحی — -/۱۰
۲۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک — مولانا مسعود عالم ندویؒ — -/۸
۳۔ عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں — پروفیسر احتشام احمد ندوی — -/۶۰
۴۔ دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار — مولانا امین احسن اصلاحی — -/۲۰
۵۔ تحریک اور کارکن — مولانا مودودیؒ — -/۱۸
۶۔ اسلام کی دعوت — مولانا جلال الدین عمری — -/۲۰
۷۔ انسانی زندگی میں جمود وارتقاء — محمد قطب — -/۳۵
۸۔ جدید جاہلیت — " — -/۳۰
۹۔ ایمان اور زندگی — علامہ یوسف القرضاوی — -/۹
۱۰۔ ایمان اور اخلاق — عبدالحمید صدیقی — -/۲۰

۱۱۔ معرکۂ فرعون وکلیم — مولانا اخلاق حسین قاسمی — -/۹
۱۲۔ معروف ومنکر — مولانا جلال الدین عمری — -/۳۵

معاشرت

۱۔ عورت اسلامی معاشرے میں — مولانا جلال الدین عمری — -/۲۵
۲۔ عورت اور اسلام — " — -/۸
۳۔ مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں — " — -/۳
۴۔ پردیس کی زندگی اور اسلام — مولانا سلطان احمد اصلاحی — -/۱۱
۵۔ کم سنی کی شادی اور اسلام — " — -/۴
۶۔ بچوں کی مزدوری اور اسلام — " — ۱/۵۰
۷۔ بندھوا مزدوری اور اسلام — " — ۱/۵۰
۸۔ پردہ — مولانا مودودیؒ — -/۲۲
۹۔ حقوق الزوجین — " — -/۱۷
۱۰۔ نکاح کے اسلامی قوانین — مولانا صدرالدین اصلاحی — -/۵

معاشیات

۱۔ اسلام اور معاشی تحفظ — یوسف القرضاوی — -/۱۵
۲۔ معاشیات اسلام — مولانا مودودی — -/۲۵
۳۔ سود — " — -/۱۶
۴۔ غیرسودی بینک کاری — ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی — -/۱۵
۵۔ قرآن کی معاشی تعلیمات — مولانا مودودی — ۲/۲۵
۶۔ مسئلہ ملکیت زمین — " — -/۶
۷۔ اسلام اور جدید معاشی نظریات — " — -/۹
۸۔ اسلام کا معاشی نظام — " — -/۳